Qila-e-Faramoshi by Fahmida Riaz: A Thematic and Ideological Study

فہمیدہ ریاض کے ناول "قلعۂ فراموشی" کا فکری و موضوعی جائزہ

Sikandar Ali
Lecturer in Urdu, Govt. Abdul Haq Islamia Associate College, Gujrat
sik03476263965@gmail.com

Abstract:
Fahmida Riaz's novel Qila-e-Faramoshi (2017) is a historical novel set in fifth-century Sassanid Iran, centered on Mazdak, regarded as history's earliest socialist revolutionary. Grounded in extensive research into primary Persian and Islamic historical sources, the novel portrays a rigidly stratified society in which the aristocracy and clergy hoard land and grain while peasants endure chronic hunger and servitude. Riaz draws a compelling parallel between Mazdak's egalitarian demand for the equal distribution of land and resources and Marxist theories of class struggle, surplus value, and collective ownership, despite Mazdak preceding Marx by fourteen centuries. The narrative equally foregrounds gender as a site of oppression, depicting the commodification of women under Sassanid customs and Mazdak's radical rejection of women as property. Tracing Mazdak's rise under King Qubad's patronage and his subsequent execution and erasure under Khosrow Anushirwan, the novel takes its title from the historical prison built to erase political prisoners from public memory. Through the fusion of documented history and imaginative reconstruction, Riaz rescues Mazdak's suppressed voice from historical oblivion, offering a narrative that speaks simultaneously to class inequality and gender injustice across centuries.

Keywords: Fahmida Riaz; Qila-e-Faramoshi; Mazdak; Sassanid Iran; Marxism; Class Struggle; Feminism; Historical Fiction

فہمیدہ ریاض کا ناول "قلعۂ فراموشی" ۲۰۱۷ء میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ یہ ناول پاکستان کی ستر ہویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والے "پلیٹینم سیریز" کا حصہ تھا اور تقریباً ایک سو اکسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ فہمیدہ ریاض کا سب سے اہم اور پختہ تاریخی ناول ہے جو پانچویں صدی عیسوی کے ساسانی ایران کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے اور اس کا مرکزی کردار مزدک ہے جسے انسانی تاریخ کا پہلا اشتراکی انقلابی تسلیم کیا جاتا ہے۔

مصنفہ نے یہ ناول ہندوستان، پاکستان اور دنیا بھر میں آباد پارسی برادری کے نام منسوب کیا ہے۔ ان کا یہ موقف ہے کہ زرتشتیوں کے قدیم اعتقادات نے ہی جدید تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار کیں۔ وہ اس مذہب کو ایرانی اور ہندوستانی ثقافت کے درمیان ایک مشترکہ رشتے کی کڑی سمجھتی ہیں۔ چونکہ ناول کا مرکز ساسانی ایران کی زرتشتی تاریخ اور مزدک جیسا انقلابی کردار ہے، اس لیے مصنفہ نے ان کے وارثوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا اپنا فرض سمجھا۔ انتساب کے صفحے پر فارسی کا یہ مصرع درج ہے جو ان کی عاجزی اور محبت کا اظہار ہے:

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

ناول کے آغاز میں فیض احمد فیض کی ایک نظم شامل کی گئی ہے جو ان کے مجموعے "سرِ وادیِ سینا" سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم پوسٹمینوں، تانگے والوں، ریل بانوں اور کارخانوں کے بھوکے مزدوروں کے نام معنون ہے۔ یعنی ٹھیک وہی طبقہ جس کے حقوق کے لیے ناول کا ہیرو مزدک پانچویں صدی کے ایران میں اپنی جان داؤ پر لگاتا ہے۔ نظم میں کسان کو "بادشاہِ

جہاں "اور "نائبِ اللہ فی الارض" کہا گیا ہے اور ناول میں بھی مزدک کا یہی موقف ہے کہ زمین کا اصل حقدار وہ کسان ہے جو اس پر محنت کرتا ہے نہ کہ وزرگان اور مقتدر طبقہ۔ نظم اور ناول کا یہ ربط محض ادبی سجاوٹ نہیں بلکہ ایک گہرا نظریاتی اتحاد ہے جو یہ پیغام دیتا ہے کہ استحصال کی کہانی چاہے پانچویں صدی کی ہو یا فیض کے عہد کی۔ اس کا درد ایک ہی رہتا ہے۔ یوں یہ نظم "فراموشی" کے خلاف ایک یادگار احتجاج کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ناول کے اصل متن سے پہلے "ناخن کا قرض" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون درج ہے جو روایتی پیش لفظ سے بالکل مختلف ہے۔ یہ دراصل ناول کی تخلیق کے پیچھے کارفرما تحقیقی سفر اور فکری محرکات کا ایک تجزیاتی بیان ہے۔ مصنفہ کے نزدیک مزدک تاریخ کا پہلا سوشلسٹ انقلابی سمجھا جاتا ہے، پھر بھی اس کے بارے میں معلومات اتنی کم کیوں ہیں؟ تحقیق سے انکشاف ہوا کہ بعد کے مورخین نے جان بوجھ کر اس تحریک کو یا تو چند سطروں میں سمیٹ دیا یا اسے منفی انداز میں پیش کیا تاکہ آنے والی نسلیں اسے بھول جائیں۔ فہمیدہ ریاض نے یہ بھی واضح کیا کہ یہ ناول ڈھائی سال کی مسلسل تحقیق اور انتھک محنت کا ثمر ہے، کوئی سرسری افسانہ نہیں۔

فہمیدہ ریاض نے "قلعۂ فراموشی" کی تخلیق کے لیے متعدد مستند تاریخی مآخذ سے استفادہ کیا۔ فردوسی کے شاہنامے میں انہیں مزدک کی تحریک سے متعلق چند اہم صفحات دستیاب ہوئے جو پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے نسخے میں محفوظ تھے۔ زرتشتیوں کی مقدس کتاب اوستا سے انھوں نے اس عہد کے مذہبی عقائد اور دعاؤں کا مواد اخذ کیا۔ ڈنمارک کے محقق آرتھر کرسٹن سین کی تصنیف "ایران بہ عہدِ ساسانیان" کو مصنفہ اپنا سب سے اہم ماخذ قرار دیتی ہیں کیونکہ اس سے انہیں ساسانی تمدن، شادی بیاہ کی رسومات، لباس، خوراک اور زیورات کے ڈیزائن تک کی باریک اور مستند معلومات ملیں۔ امام طبری کی تاریخِ طبری سے پانچویں صدی کے ایران، روم اور سفید ہنوں سے متعلق حقائق حاصل ہوئے۔ اس کے علاوہ فلپ ہٹی کی "تاریخِ عرب"، جی لی اسٹرینج کی "جغرافیہ خلافتِ مشرقی"، بائبل اور انٹرنیٹ سے بھی تکمیلی مواد لیا گیا۔ مصنفہ نے صراحت کی کہ تاریخی ڈھانچہ تو انہی مآخذ سے لیا گیا مگر کرداروں کو جیتا جاگتا بنانے کے لیے تخیل نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

"قلعۂ فراموشی" کوئی خیالی جگہ نہیں بلکہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے۔ قدیم ایران کے صوبہ خوزستان میں ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ موجود تھا جسے آرمینی زبان میں "اندمیشن"، پہلوی میں "گیل گرد" اور فارسی میں "انوش بُرد" یعنی قلعۂ فراموشی کہا جاتا تھا۔ یہ قلعہ سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص تھا اور اس کا مقصد صرف سزا دینا نہیں بلکہ قیدیوں کو عوام کی یادداشت سے ہمیشہ کے لیے مٹا دینا تھا۔ اس قلعے کا نام لینا تک قانوناً ممنوع تھا۔ فہمیدہ ریاض نے مزدک کی داستان کے لیے اسی علامت کا انتخاب کیا کیونکہ ساسانی حکمرانوں نے مزدک کے نظریات اور اس کی یاد کو مٹانے کے لیے اسے اسی قلعے کی نذر کیا تھا۔

ناول کا بنیادی موضوع اشتراکیت اور طبقاتی کشمکش ہے۔ مرکزی کردار مزدک وسائل کی منصفانہ تقسیم کا علمبردار ہے تاکہ امیر اور غریب کے درمیان کی گہری خلیج کو ختم کیا جا سکے۔ اگرچہ کارل مارکس صدیوں بعد پیدا ہوئے مگر فہمیدہ ریاض نے ناول میں یہ ثابت کیا ہے کہ مزدک کی فکر اور مارکسی تصورات میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ جدلیاتی مادیت کے مطابق دنیا میں کوئی چیز ساکن نہیں اور ہر شے تضادات کے ٹکراؤ سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ معاشرتی تبدیلی بھی انہی تضادات کا نتیجہ ہے اور مزدک کی تحریک اسی اٹل اصول کی پانچویں صدی میں سب سے روشن مثال تھی۔ اشرفی جدلیاتی مادیت کے نظریے کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

> "جدلیات محض ایک علمی اصطلاح نہیں، بلکہ یہ فطرت اور انسانی سماج کے پوشیدہ تانے بانے کو سمجھنے کا ایک بصیرت افروز طریقہ کار ہے۔ اس فلسفے کا نقطہ آغاز یہ اٹل حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر اکائی

مسلسل تغیر اور ایک ناختم ہونے والے بہاؤ کی زد میں ہے ۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ جمود محض ایک سراب ہے؛ حقیقت میں کائنات کی ہر شے ہر لمحہ تبدیلی، حرکت اور ارتقاء کے عمل سے گزر رہی ہے۔جسے ہماری آنکھیں ساکن دیکھتی ہیں، اس کے اندر مادے کا ایک طوفان برپا ہے؛ مالیکیول اور ایٹمی ذرات مسلسل اپنی جگہ بدل رہے ہیں اور ہمہ وقت متحرک ہیں۔ پس جدلیات مادے کی اسی حرکیاتی فطرت کی وہ جامع توضیح ہے جو نامیاتی اور غیر نامیاتی کائنات کے ہر ذرے میں ایک نظام کے تحت کارفرما نظر آتی ہے۔اس نظریے کے مطابق، یہی مادی حرکت اوراندرونی تضادات وہ قوتیں ہیں جو کائنات کے ارتقا اور معاشرتی تبدیلیوں کی بنیاد بنتی ہیں۔"(۱)

ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت مارکسی فکر کا مرکز ہے۔ زمین، کارخانے اور وسائل چند افراد کی ملکیت نہیں ہونے چاہئیں بلکہ پورے معاشرے کی امانت ہونے چاہئیں۔ جب تک یہ چند ہاتھوں میں رہیں گے، محنت کش کا استحصال جاری رہے گا۔اینگلز سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ کرتا ہے:

"مزدور دن رات محنت کرتا ہے لیکن اسے صرف اتنی اجرت ملتی ہے جس سے وہ بمشکل زندہ رہ سکے، جبکہ اس کی محنت کا اصل ثمر یعنی زائد قدر (Surplus Value) سرمایہ دار کی جیب میں چلا جاتا ہے جو اس کی دولت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ کارل مارکس کے مطابق یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے سرمایہ دارانہ نظام میں استحصال کا آغاز ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندرونی تضادات اور بحرانوں کی وجہ سے ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں 'Have and Have nots' کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج صرف ایک عظیم معاشی اورسماجی انقلاب کے ذریعے ہی ختم کی جا سکتی ہے۔ مارکسی نظریہ اس استحصال کے خاتمے اور محنت کشوں کے حقوق کی بحالی پر زور دیتا ہے تاکہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو سکے۔"(۲)

انسانی تاریخ کا پہلا معاشی نظام اشتراکی تھا جہاں سب مل بانٹ کر گزارہ کرتے تھے اور کوئی کسی سے زیادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے پیداواری وسائل میں اضافہ ہوتا گیا، انسانی سماج کا یہ فطری توازن بگڑنے لگا۔ نجی ملکیت کا تصور ابھرا اور اس نے معاشرے کو دو ایسے متضاد حصوں میں کاٹ دیا جن کے درمیان پل بنانا ناممکن ہو گیا۔ ایک طرف بورژوا یعنی وسائل کے مالک اور دوسری طرف پرولتاریہ یعنی وہ محنت کش جو انہی وسائل پر کام کرتے ہیں مگر ان کے مالک نہیں۔ فہمیدہ ریاض نے ساسانی ایران کو اسی طبقاتی کشمکش کا آئینہ بنا کر پیش کیا ہے جہاں امراء کے محل اور معبدوں کے گودام غلے سے لبریز تھے جبکہ کسان نسل در نسل بھوک اور افلاس کی چکی میں پستے چلے آ رہے تھے۔یہی معاشی ناہمواری نجی ملکیت کے استحصالی نظام کی جڑ بنی اور صدیوں تک انسانی سماج کو اپنی گرفت میں رکھا۔

مزدک نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے یہ انقلابی موقف اختیار کیا کہ چونکہ تمام انسانوں کو ایک ہی خالق نے پیدا کیا ہے اس لیے زمین اور دولت پر سب کا برابر کا حق ہے۔ کوئی ایک طبقہ وسائل پر اجارہ داری نہیں جما سکتا اور نہ ہی کسی کی محنت کا پھل کوئی دوسرا ہتھیا سکتا ہے۔ یہ سوچ عین اسی فکر سے ہم آہنگ ہے جسے صدیوں بعد مارکسی اشتراکیت نے ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت کے اصول کی صورت میں پیش کیا۔ مزدک نے کسانوں اور محنت کشوں میں یہ شعور بیدار کیا کہ ان کی محنت کا ثمر امراء کے گوداموں کی زینت بننے کے لیے نہیں بلکہ ان کے اپنے گھروں کو روشن کرنے کے لیے ہے۔مارکسی فکر میں اسی عمل کو "قدرِ زائد" کا استحصال کہا جاتا ہے اور مزدک نے صدیوں پہلے اسی کھلے ظلم کو للکارا تھا۔

ساسانی ایران کے وزرگان اور موبدان وہی کردار ادا کرتے ہیں جسے مارکسی اصطلاح میں بورژوا کہا جاتا ہے۔ وہ کسانوں کا غلہ چھینتے ہیں، "زنِ چگاری" جیسی ذلت آمیز رسومات کے ذریعے عورتوں کا جنسی اور معاشی استحصال کرتے ہیں اور

مذہب کو اپنی اجارہ داری کی ڈھال بناتے ہیں۔ مزدک اس پورے ڈھانچے کو للکارتا ہے، اسے جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا "جرم" قرار پاتا ہے۔ مارکس کا سنہری اصول جو یہ تھا کہ منافع کسی سرمایہ دار کی تجوری میں جانے کے بجائے غذا، مکان، تعلیم اور صحت کی صورت میں ہر شہری تک پہنچے۔ مزدک نے اسی اصول کو پانچویں صدی میں اپنے عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔

قلعۂ فراموشی" محض ایک تاریخی ناول نہیں بلکہ یہ ایک ایسی آواز ہے جو پانچویں صدی کے ایران سے اٹھ کر آج بھی گونجتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے مزدک کو تاریخ کے "قلعۂ فراموشی" سے نکال کر ادب کے صفحات پر زندہ کر دیا اور ساتھ یہ یاد دہانی بھی کرائی کہ جبر اور استحصال کی کہانی نہ کسی صدی سے مخصوص ہے اور نہ کسی جغرافیے سے۔ یہ ہر عہد کا دکھ ہے اور ہر دور کا انسان اس سے پہچانا جاتا ہے۔

ناول کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ جب تک وسائل چند ہاتھوں میں سمٹے رہیں گے، معاشرے میں حقیقی امن اور انسانی فلاح کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔ مزدک کی تحریک محض مذہبی اصلاح نہیں تھی بلکہ یہ ایک مکمل معاشی انقلاب تھا جس کی لہریں اتنی طاقتور تھیں کہ شہنشاہِ وقت قباد بھی اس سے لاتعلق نہ رہ سکا اور امراء کی جاگیریں اور غلے کے ذخائر عوام کے لیے کھولنے کا اعلان کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ تحریک بعد میں طاقت کے بل پر کچل دی گئی مگر مزدک کا وہ خواب کہ انسان اور انسان کے درمیان کوئی فرق نہ ہو، وسائل سب میں برابر تقسیم ہوں اور کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔ یہ خواب آج بھی جدید معاشی فکر اور مارکسی فلسفے کی روح میں دھڑکتا ہے۔ تو اس منظر کی عکاسی ریاض درج ذیل الفاظ میں کرتی ہیں:

> "اے لوگو!" اس نے کہا۔۔۔ اور کاغذ کی چند لائینوں سے پڑھنا شروع کیا۔ "سب سے پہلے تو تمام کسانوں، دست کاروں، مزدوروں، کان کنوں کا شخصی لگان معاف کیا جاتا ہے جو پیشہ ور غلاموں کو بھی وزرگان، موبدوں اور امراء کو دینا پڑتا تھا۔" مجمعے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے جبری تحفے جو موبدان وصول کرتے رہتے تھے، آج منسوخ کیے جا رہے ہیں۔" مجمع دم بخود۔ دولتِ ساسانیہ کی تمام زرعی زمینیں، جو امراء کی ملکیت تھیں، بحکمِ شہنشاہ آج تمام لوگوں میں برابر تقسیم کی جاتی ہیں۔"(۳)

فہمیدہ ریاض نے ناول میں اس طبقاتی تضاد کو بڑی گہرائی سے اجاگر کیا ہے۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جس کے پاس زمین ہے، غلے کے گودام ہیں اور وسائل پر مکمل قبضہ ہے۔ دوسری طرف وہ کسان اور محنت کش ہیں جو صبح سے شام تک کھیتوں میں جھکے رہتے ہیں مگر اپنی ہی محنت کے پھل سے محروم ہیں اور بھوک ان کا مقدر بن چکی ہے۔ مارکسی فکر کی رو سے یہی وہ بنیادی تضاد ہے جو معاشرے کو ایک نہ ایک دن انقلاب کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ مزدک نے اسی ناانصافی کو پہچانا اور اس کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کا مطالبہ سادہ مگر انقلابی تھا کہ وسائل چند گھرانوں کی میراث نہیں بلکہ پورے سماج کا حق ہیں۔ یہ نظریہ عین وہی فکر ہے جسے بعد میں مارکسی اشتراکیت نے ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت کے تصور کی صورت میں دنیا کے سامنے رکھا۔ ساسانی دور کا ایران ایک ایسے سخت اور جامد طبقاتی ڈھانچے پر کھڑا تھا جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ معاشرہ چار واضح خانوں میں بٹا ہوا تھا: علما، سپاہی، دبیران اور عوام الناس۔ یہ تقسیم محض رسمی نہیں تھی بلکہ اس کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ ایک طبقے سے دوسرے میں منتقلی تقریباً ناممکن تھی۔ جو جس گھر میں پیدا ہوا، اسی دائرے میں جیا اور اسی میں مر گیا۔ اسی بند نظام کی آڑ میں حاکم طبقے یعنی وزرگان اور امراء نے کسانوں اور مزدوروں کے معاشی استحصال کو ایک قانونی اور

مذہبی جواز دے رکھا تھا۔ نچلا طبقہ اوپر نہیں آ سکتا تھا اور اوپر والا نیچے آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نظام اپنی فطرت میں ہی ظلم کا ایک مستقل ڈھانچہ تھا۔ناول سے اقتباس دیکھیے۔

> "یہاں تک کہ کرسیوں کے بعد قالینوں پر مودب بیٹھے ہوئے عامیوں کا ہجوم تھا۔ ان میں کسان، کاریگر، معمولی دوکاندار بلکہ اس خاص تقریب کے لیے حراست خانوں اور عقوبت خانوں سے بلوائے گئے مجرم بھی موجود تھے اس ساسانی دربار میں ایک تنکا بھی جگہ سے بے جگہ نہ تھا۔ یہ ایک مکمل منصبی اور طبقاتی تقسیم تھی۔"(۴)

فہمیدہ ریاض نے "قلعۂ فراموشی" میں پانچویں صدی کے ساسانی معاشرے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اپنی تلخی میں بے مثال ہے۔ اس عہد میں انسان کی قدر و قیمت نہ اس کے علم سے ناپی جاتی تھی، نہ اس کے کردار سے؛ صرف اور صرف نسب ہی وہ پیمانہ تھا جس پر سب کچھ طے ہوتا تھا۔ وزرگان اور امراء اپنے آپ کو اعلیٰ نسل کا نمائندہ سمجھتے تھے اور عوام الناس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا ان کا پیدائشی حق تھا۔ مصنفہ نے اس نسبی برتری کے غرور کا پردہ نہایت بے باکی سے چاک کیا ہے۔ وہی امراء جو اپنی پاک نسل کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے، رات کے اندھیرے میں کسانوں اور عامیوں کی عورتوں کا استحصال کرتے تھے۔ اس خون کے اختلاط نے ان کی نام نہاد نسبی برتری کو ایک کھوکھلے دعوے میں بدل کر رکھ دیا تھا۔اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "ازروئے نسب!وہ سوچ رہا تا۔ جس طرح عامیوں کی عورتوں کو دن رات یہ رؤسا اٹھالے جاتے ہیں۔ تو کتنے ہی نسبی شہزادگان اور وزرگان تو کسانوں کی جھونپڑوں میں کھیل رہے ہیں اور ان کی عورتیں۔ جو کسانوں کے کسے کسائے جسموں پر فریفتہ رہتی ہیں۔ کیا کوئی سچ مچ بتا سکتا ہے کہ کتنے کسانوں کے بیجوں کا پھل ان محلات کے باغوں میں جوانی کا رس پکڑ رہا ہے۔"(۵)

مزدک "ازروئے نسب" کی ترکیب پر غور کر رہا ہے۔ ساسانی معاشرے میں نسب ہی وہ پیمانہ تھا جس سے انسان کی قدر و قیمت ناپی جاتی تھی۔ اونچے گھرانے میں پیدا ہونا فضیلت کی دلیل اور نچلے گھر میں جنم لینا ذلت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مزدک اس مقدس سمجھے جانے والے تصور کی جڑ پر ہی کلہاڑی چلاتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جس نسب پر یہ حاکم طبقہ اتنا ناز کرتا ہے، اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے جنسی استحصال کو طبقاتی جبر کی ایک اہم علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ امراء اور روسا عامیوں کی عورتوں کو "دن رات اٹھالے جاتے ہیں"یہ محض اخلاقی بے راہ روی نہیں بلکہ طاقت کا وہ بے لگام اظہار ہے جو کمزور طبقے کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کی عزت، ان کا گھر اور ان کی عورتیں بھی محفوظ نہیں۔ یہ استحصال اقتصادی ظلم کے ساتھ ساتھ انسانی وقار کی بھی پامالی ہے۔مزدک نسب کے دعویداروں کو ان کے اپنے آئینے میں دکھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو امراء نسب کی پاکیزگی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، ان کے محلات کے باغوں میں پلنے والے "شہزادے" درحقیقت کسانوں کے خون کا پھل ہیں۔ یہ طنز صرف ذاتی نہیں بلکہ پورے نظامِ طبقات کی اخلاقی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔مصنفہ نے امراء کی عورتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو کسانوں کے "کسے کسائے جسموں پر فریفتہ رہتی ہیں۔" یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ انسانی فطرت کسی طبقے کی پابند نہیں۔ نچلے طبقے کا انسان بھی جذبات رکھتا ہے اور اوپری طبقے کی عورت بھی۔ یوں مصنفہ نے طبقاتی برتری کے تصور کو فطری سطح پر بھی بے معنی ثابت کر دیا ہے۔

اس نسبی خبط کے پیچھے ایک ایسی معاشی ناہمواری موجود تھی جو دیکھنے والے کا دل دہلا دے۔ امراء کے محلات اور معبدوں کے گودام غلے سے اٹے پڑے تھے جبکہ کسان اپنے بھوک سے مرے ہوئے بچوں کو اٹھائے دربدر بھٹکتے پھرتے تھے۔ ساسانی دربار کی فضا ایسی تھی کہ وہاں نشستوں کی ترتیب تک میں کوئی تبدیلی ناممکن تھی۔

عام آدمی کی حیثیت نہ کسی شہری کی تھی، نہ کسی انسان کی ۔وہ محض ایک تماشائی تھا یا پھر مجرم۔ مذہب اور سیاست کے اس گٹھ جوڑ نے معاملے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا تھا۔ مذہب کے مقدس نام پر جبری چڑھاوے وصول کیے جاتے، کسانوں کا خون نچوڑا جاتا اور یہ سب کچھ خدا کی مرضی کے نام پر ہوتا تھا۔ یوں اندر سے کھوکھلا ہو چکا یہ معاشرہ اپنے ہی بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا تھا۔یہی وہ زمین تھی جس میں مزدک کی فکر نے بیج کی صورت اختیار کی۔ جب انسانی تذلیل حد سے گزر جائے، جب بھوک نسل در نسل وراثت بن جائے اور جب مذہب بھی ظالم کا ہتھیار بن جائے ۔ تو پھر خاموشی ٹوٹتی ہے اور احتجاج کی آواز اٹھتی ہے۔ مزدک کی تحریک کوئی اچانک پھوٹنے والا شعلہ نہیں تھی بلکہ یہ برسوں کے دبے ہوئے غم و غصے کا وہ اظہار تھا جسے اب روکا نہیں جا سکتا تھا۔ مساوات اور برابری کا مطالبہ جب لاکھوں محروم انسانوں کی زبان بن گیا تو ایک ایسی عوامی اور اشتراکی تحریک نے جنم لیا جس نے ساسانی سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

فہمیدہ ریاض نے مزدک کو ناول میں ایک ایسے صاحبِ فکر انسان کے روپ میں پیش کیا ہے جو اپنے زمانے کے چلے آتے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس دور میں زمین، غلہ اور دولت پر تصرف صرف امراء اور معبدوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔ یہ قبضہ نہ کسی محنت کا صلہ تھا اور نہ کسی قابلیت کا انعام۔ بس طاقت کے زور اور نسب کے غرور نے چند خاندانوں کو یہ حق دے رکھا تھا کہ وہ سب کچھ اپنے ہاتھوں میں سمیٹے رکھیں اور باقی سب محروم رہیں۔ مزدک نے اس پورے نظام کو للکارا اور اس کے پاس مذہبی دلیل تھی جو انسانی فطرت کی آواز بھی اٹھاتی تھی۔ اس کا نقطہ نظر بظاہر سیدھا سادہ تھا مگر اس کے اثرات انقلابی تھے۔ وہ کہتا تھا کہ جب خالقِ کائنات نے تمام انسانوں کو ایک ہی مٹی سے بنایا اور ایک ہی دنیا میں اتارا تو پھر اس دنیا کے وسائل پر چند لوگوں کی اجارہ داری کا کیا جواز ہے۔ مزدک عوامی شعور بیدار کرنے کے لیے مزدوروں سے مخاطب ہوتا ہے:

> "میرے بھائیو! یہ دنیا، یہ زمین، یہ پانی، خدائے بزرگ و برتر نے تخلیق کیے ہیں۔ یہ کسی کی ملکیت کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان پر گرمی سردی میں رات دن محنت تم کرتے ہو۔ بیج تم بوتے ہو۔ اناج تم اگاتے ہو۔ وہ تمھارا ہے۔ اناج اس کا ہے جو محنت کر کے اسے اگاتا ہے۔ یہ تم ہو جو محترم و قابلِ تعظیم، مستحقِ ثنا اہورامزدا کے منصوبے کی تکمیل کرتے ہو کہ زمین ہری بھری رہے، اناج، پھل پھول پیدا کرے۔ یہ وزرگان اور دبیران اور امراء چور لٹیرے ہیں۔ تم ان سے اپنا حق چھین کیوں نہیں لیتے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ انہونی ہے آقا! وہ ہمیں اپنے گھوڑوں کے سموں تلے کچل پھینکیں گے۔"(۶)

مزدک نے معبدوں کے بھرے ہوئے گوداموں کی طرف انگلی اٹھائی اور کسانوں کے حقوق کے لیے علم بغاوت بلند کیا۔ اس کے نزدیک کسان صبح سے شام تک کھیتوں میں محنت کرتا ہے مگر اس کی محنت کا پھل امراء کی تجوریوں میں جا کر دفن ہو جاتا ہے۔ مزدک نے اس شعور کو عوام تک پہنچایا کہ محنت کا صلہ محنت کش کا حق ہے، کسی اور کا نہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مزدک کی فکر اپنے اندرونی مزاج میں مارکسی اشتراکیت سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ کارل مارکس نے انیسویں صدی میں ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت کا جو نظریہ پیش کیا، مزدک نے اسی بات کو چودہ سو سال پہلے مذہبی زبان اور مذہبی دلائل کے ذریعے بیان کیا تھا۔ دونوں کی منزل ایک ہی تھی۔ وسائل چند مٹھی بھر لوگوں کی گرفت سے نکل کر پورے سماج کی مشترکہ امانت بنیں اور استحصال کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ فہمیدہ ریاض نے اس فکری ہم آہنگی کو ناول کے تانے بانے میں اس خوبصورتی سے پرویا ہے کہ یہ کہیں سے تھوپا ہوا

نہیں بلکہ کہانی کے اندر سے خود بخود ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ باور کرایا ہے کہ انسانی مساوات اور برابری کی یہ صدا کوئی نئی دریافت نہیں بلکہ اس کی جڑیں تاریخ کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست ہیں۔

اسی طرح فہمیدہ ریاض نے "قلعۂ فراموشی" میں بھوک کو کسی ایک کردار کی ذاتی تکلیف بنایا بلکہ اسے پانچویں صدی کے ساسانی معاشرے میں سرایت کیے ہوئے طبقاتی ظلم اور معاشی ناانصافی کا بولتا ہوا استعارہ بنا دیا ہے۔ یہ بھوک اس گہری اور بڑھتی ہوئی خلیج کی علامت ہے جو معاشرے کو دو ایسے حصوں میں کاٹ دیتی ہے جن کے درمیان کوئی پل نہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کے گودام اناج سے لبریز ہیں اور دوسری طرف وہ گھرانے ہیں جہاں چولہا جلانے کو کچھ نہیں۔ یہ تقسیم کسی قدرتی ناگزیریت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ایسے سوچے سمجھے نظام کی پیداوار ہے جو کمزور کو کمزور رکھ کر ہی اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔

ناول میں یہ طبقاتی تضاد اپنی پوری سفاکیت کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ کسان کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں معصوم بچے بھوک کی اذیت سہتے سہتے آخری سانس لیتے ہیں اور باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کی ٹھنڈی لاش سینے سے لگائے کسی در پر دستک دینے کو بھٹکتا پھرتا ہے۔ اور اسی سلطنت میں چند قدم کے فاصلے پر شہزادوں کے محلات جگمگا رہے ہیں اور معبدوں کے گودام اناج کے انبار تلے دبے ہوئے ہیں۔ یہ دو متضاد منظر ایک ہی سماج کے دو چہرے ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کارل مارکس نے اپنے نظریے میں جس استحصال کی بات کی تھی، یہ اس کی سب سے کھلی اور سب سے دردناک تصویر ہے۔ جب زمین، غلہ اور تمام وسائل چند گھرانوں کی میراث بن جائیں تو ایک ایسا گھن چکر شروع ہوتا ہے جو نچلے طبقے کو نیچے ہی رکھنے کے لیے بنا ہوتا ہے۔ اور اس چکر سے نکلنے کا راستہ خود یہ نظام کبھی نہیں دیتا۔ ناول سے اقتباس بطور مثال دیکھیے:

> "کیا بات ہے کرشنان؟" مزدک نے پوچھا۔ "میرا بچہ!" اس نے کہا۔ "اس کو کئی دن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ دیکھیے اسے کیا ہو گیا ہے۔" مزدک نے بچے کے خوبصورت چہرے سے الجھے ہوئے بال ہٹا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بچے کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ اس کے سوکھے ہوئے گلابی ہونٹ اب بھی بسور رہے تھے۔ بند آنکھوں کی سیاہ پلکوں کی صف بچکانہ رخساروں پر ساکت تھی۔ بچے کو مرے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔" (۷)

مزدک کے وجود میں جو انقلابی تڑپ ہے، جو اندر تک اتری ہوئی تلخی ہے اور جو فکری پختگی ہے یہ سب کسی خلا میں سے نہیں اٹھی بلکہ اس بھوک کی بھٹی میں تپ کر نکلی ہے جو اس نے اپنے چاروں طرف دیکھی۔ جب اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا کہ باپ اپنے بچوں کی لاشیں اٹھائے سرگرداں ہے اور شاہی گوداموں میں اناج بوسیدہ ہو رہا ہے، تو اس کے اندر کا انسان مزید خاموش نہ رہ سکا۔ یہ خاموشی ٹوٹی تو ایک ایسی آواز بن کر ابھری جس نے پورے سماج کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے دبے کچلے لوگوں کو یہ شعور دیا کہ ان کی یہ بدحالی اور بے وقعتی ان کی تقدیر نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک منظم ناانصافی ہوتی آئی ہے، ان کا حق دن دیہاڑے چھینا گیا ہے اور اسے واپس لینا ان کا نہ صرف حق بلکہ فرض بھی ہے۔ یہی وہ نازک اور تاریخ ساز لمحہ تھا جب ایک اکیلے انسان کا ذاتی درد سمٹ کر لاکھوں محروم انسانوں کی آواز بن گیا اور ایک تحریک نے جنم لیا جس کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہی۔

ساسانی دور کے ایران میں مذہب کا کردار محض روحانی رہنمائی تک محدود نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا ہتھیار بن چکا تھا جسے سیاسی اقتدار اور معاشی استحصال کو مستحکم کرنے کے لیے بڑی چالاکی سے استعمال کیا جاتا تھا۔ موبدان اور وزرگان نے مل کر ایک ایسا اتحاد قائم کر رکھا تھا جس کی بنیاد ہی نچلے طبقات کو ہمیشہ کے لیے دبائے رکھنے پر تھی۔ ایک نے تلوار تھامی تھی اور دوسرے نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مگر دونوں کا نشانہ ایک ہی تھا۔ معبدوں کے گودام بھرنے کے لیے کسانوں کی محنت کی کمائی کو "جبری چڑھاوے" اور "نذرانوں" کے مقدس نام سے وصول کیا جائے۔ جو کسان یہ نذرانہ ادا کرنے سے

قاصر ہوتا، اسے دین سے خارج قرار دے دیا جاتا۔ یعنی ایک طرف بھوک تھی اور دوسری طرف مذہبی بے دخلی کا خوف۔ اور اس دوہرے خوف کے بیچ کسان پستا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ معبدوں کے گودام اناج کے ڈھیروں سے اٹے رہتے اور کسانوں کے بچے بھوک سے تڑپ تڑپ کر دم توڑتے رہتے۔ یہ کوئی اتفاقیہ صورتحال نہیں تھی بلکہ ایک سوچے سمجھے نظام کا حصہ تھی۔ مزدک نے اسی نظام کی جڑ پر ضرب لگائی۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ ان کی محرومی خدا کی مرضی نہیں بلکہ انسانوں کی بنائی ہوئی ناانصافی ہے۔ زمین اور وسائل پر سب کا برابر حق ہے کیونکہ سب کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ پیغام صرف معاشی مطالبہ نہیں تھا بلکہ ذہنی آزادی کا اعلان تھا۔ جب مظلوم کو یہ شعور ہوتا ہے کہ اس کو زنجیریں خدا نے نہیں انسان نے ڈالی ہیں تو پھر وہ انہیں توڑنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ناول میں مزدک کی فکر ایک تحریک میں ڈھل گئی:

> "اے خدائے پاک! اے اہورا مزدا! خدائے بزرگ و برتر، پاک پروردگارِ کائنات مجھے ہمت دے، اے اہورا مزدا۔ مجھے طاقت دے کہ میں ثابت قدمی سے وہ کچھ کہہ سکوں جو میرے دل و دماغ میں بالکل صاف صاف آرہا ہے۔۔۔ لیکن لوگوں میں زبردستی کے ذریعے نابرابری پیدا کی گئی اور یہ اہرمن کی کارستانی تھی۔ اس کے شر کے بس میں آکر ہر شخص نے یہ کوشش کی کہ دوسرے کا حصہ چھین کر اپنی خواہشات پوری کرے۔ دنیا میں جتنا دکھ ہے وہ اسی نابرابری کی وجہ سے ہے۔ اس کے لیے لوگ آپس میں لڑتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں، ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ اسی نابرابری کے باعث انسان روئے زمین پر ہزاروں برس سے خوار ہے۔"(۸)

اس پورے استحصال کا سب سے خوفناک اور دیرپا پہلو وہ نہیں تھا جو جسم پر گزرتا تھا بلکہ وہ تھا جو ذہن کے اندر اتر کر بیٹھ جاتا تھا۔ مذہب کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے غریب طبقے کے ذہنوں میں یہ سوچ راسخ کر دی گئی تھی کہ ان کی بھوک، ان کی بے بسی اور ان کی پستی سب کچھ اوپر سے لکھا ہوا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی تباہی کو خدا کا فیصلہ مان لیتا ہے تو پھر اس کے اندر احتجاج کی چنگاری سلگتی ہی نہیں۔ وہ نہ کوئی سوال اٹھاتا ہے، نہ کھڑا ہوتا ہے اور نہ مزاحمت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بس اپنی قسمت کو سینے سے لگائے گھٹتا رہتا ہے۔ یہی وہ غیر مرئی قید تھی جو کسی بھی لوہے کی زنجیر سے کہیں زیادہ پائیدار اور زیادہ ظالم تھی کیونکہ اسے کاٹنے کے لیے باہر سے نہیں بلکہ اپنے ہی اندر سے لڑنا پڑتا تھا۔ اپنے ہی پختہ یقین کو چیلنج کرنا پڑتا تھا۔

فہمیدہ ریاض نے "قلعۂ فراموشی" میں ساسانی دور کی عورت کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ قاری کے دل پر ایک بوجھ سا ڈال دیتا ہے۔ اس زمانے میں عورت کا وجود کسی آزاد اور بااختیار انسان کا وجود نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی چیز تھی جسے بازار میں بیچا جا سکتا تھا، کسی کو نذر کیا جا سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر کسی اور کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ امراء اپنی عورتوں کو "اعراتی" کے نام پر دوستوں اور عزیزوں کو اس بے تکلفی سے سونپ دیتے تھے جیسے کوئی بے جان اور بے حس شے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پھسل رہی ہو۔ "زنِ چگاری" کی اصطلاح اس ذلت کا سب سے کھلا اور سب سے تکلیف دہ اظہار ہے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جنہیں امراء نے اپنی جنسی تسکین اور باہمی لین دین کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ یہ سارا نظام اس ایک سوچ پر قائم تھا کہ عورت انسان نہیں، ملکیت ہے اور ملکیت کے ساتھ جو چاہو کرو۔ ناول میں مصنفہ عورت کی مشترکہ ملکیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> " اب یہ عورتوں کو بھی مشترکہ ملکیت بنائیں گے۔ کچھ پتہ نہ ہوگا کہ کس بچے کا باپ کون ہے۔ آہ! تو کیا عظیم سلطنت آریانیان سے نسب کی شناخت اٹھ جائے گی؟" اس کی نظر میں یہ قانون خدائے پاک کی بدترین توہین تھی۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ نسب معاشرے میں بری طرح خلط ملط صدیوں سے ہوتی آئی تھی، لیکن ان ہی معاشروں کے ایک زرکار حاشیے میں وہ محفوظ بھی تھے۔ سب باخبر تھے اور تسلیم کر سکتے تھے کہ منصب دار کے بیٹے منصب دار، موبدان کے بیٹے موبدان، وزرگان کے

بیٹے وزرگان بنیں گے۔ باپ کا نسب آگے بڑھائیں گے۔ یہ بدمعاش کمینگی اور غلاظت کو شرافت اور نجابت سے خلط ملط کرنے کے درپے ہیں۔ یہ مملکت ایک جہنم بن جائے گی۔"(۹)

مصنفہ نے ان مذہبی اور سماجی رسوم کی تصویر کشی بھی نہایت بے باکی سے کی ہے جو عورت کی روزمرہ زندگی کو عذاب بنا دیتی تھیں۔ حیض کے دوران عورت کو ناپاک قرار دے کر گھر سے باہر ایک تنگ اور تاریک کوٹھری میں ننگے فرش پر سونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ رسم ملکہ سلطنت دینگ کے ساتھ بھی آزمائی گئی جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ظلم کسی ایک طبقے تک محدود نہیں تھا بلکہ پورے سماج میں عورت کی حیثیت یکساں طور پر کمتر تھی۔ پاکی کے غسل تک بستر پر سونا گناہ تھا یعنی مذہب بھی عورت کو دبانے کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔

ناول کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مصنفہ نے حاکم طبقے کے اس خوف کو بھی بے نقاب کیا ہے جو عورت کی آزادی کے تصور سے انہیں لاحق تھا۔ روز مہر جیسے کرداروں کے ذریعے یہ سوچ سامنے آتی ہے کہ اگر عورتیں آزاد ہو گئیں تو نسب کی شناخت ختم ہو جائے گی اور شرافت و نجابت کا وہ فرق مٹ جائے گا جس پر ان کی پوری برتری کی عمارت کھڑی تھی۔ یہ خوف دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ عورت پر قبضہ محض جنسی تسکین کے لیے نہیں بلکہ طبقاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا۔

فہمیدہ ریاض نے اس ناول میں اپنے گہرے نسائی شعور کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ساسانی معاشرت کی جزئیات پکوان، لباس، رہن سہن اور عورتوں کے حسن و جمال کو اس باریک بینی سے بیان کیا ہے جو ایک ایسی مصنفہ ہی کر سکتی ہے جو عورت کی نفسیات کو اندر سے سمجھتی ہو۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ سیاسی جبر کے تمام ہتھیار عورتوں پر بھی آزمائے جاتے تھے اور ان کا معاشی اور جنسی استحصال ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ہی نظام کے دو چہرے تھے۔ غفار مذہبی اجارہ داری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"مذہب کی آڑ میں غریب اور بے بس طبقے کا خون نچوڑنا جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کا ہمیشہ سے پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ ناول اس تاریخی حقیقت کو بھی بے نقاب کرتا ہے کہ غلاموں کی تعداد میں اضافہ کیوں اور کیسے ہوتا تھا۔ جب معاشی بدحالی اپنے عروج پر ہوتی اور غریب کسان قرض کی دلدل سے نہ نکل پاتا تو وہ مجبور ہو کر خود کو بیچ دیتا یا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ اسی المناک لین دین سے غلاموں کی منڈیاں آباد ہوتی تھیں اور ایک بار بک جانے کے بعد انسان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کیا جا سکتا تھا۔ اس کی پٹائی اور تذلیل کے لیے باقاعدہ قوانین وضع کیے جاتے تھے۔ ناول نگار نے جدلیاتی کشمکش کو بنیاد بناتے ہوئے اس پورے موضوع کو فنی پختگی اور تخلیقی مہارت کے ساتھ قاری کے سامنے رکھا ہے۔"(۱۰)

"قلعۂ فراموشی" میں تانیثی حوالہ محض عورتوں کی داستانِ غم نہیں ہے بلکہ یہ اس طبقاتی اور صنفی جبر کا مکمل نوحہ ہے جہاں عورت کو انسان نہیں بلکہ ایک پیداواری آلہ سمجھا جاتا تھا۔ مزدک کی تحریک نے اس اجارہ داری کو توڑنے اور عورت کو اس کا انسانی وقار دلوانے کی کوشش کی۔ فہمیدہ ریاض نے پانچویں صدی کی اس کہانی کو آج کے قاری تک اس طرح پہنچایا ہے کہ اس کی تلخی آج بھی اتنی ہی محسوس ہوتی ہے۔ مزدک نے اس پورے نظام کو سرے سے مسترد کر دیا۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ عورت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک انسان ہے اور انسان کو کسی کی جائیداد نہیں بنایا جا سکتا۔ مزدک کا یہ نظریہ اپنی بنیاد میں اسی فکر سے جڑا ہے جسے بعد میں مارکسی فلسفے نے نجی ملکیت کے خاتمے کی صورت میں پیش کیا۔ جس طرح مارکس نے کہا کہ زمین اور وسائل چند افراد کی ملکیت نہیں ہو سکتے، اسی طرح مزدک نے کہا کہ انسان بھی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتا خواہ وہ غلام ہو یا عورت۔ مزدک نے محض نظریہ پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے عملی

شکل دینے کی کوشش بھی کی۔ اس نے امراء کی "چنگاری بیویوں" کو آزاد کر کے ان غریب کسانوں اور محنت کشوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا جو غربت اور مہر کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ فیصلہ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو عجیب لگ سکتا ہے مگر اس کی گہرائی میں ایک بڑا سماجی پیغام تھا۔ یہ اس اجارہ داری کو توڑنے کی کوشش تھی جس کے تحت امراء نے عورتوں کو بھی اپنی دولت اور طاقت کی علامت بنا رکھا تھا۔

مارکسی فلسفے کی طرح مزدک کا حتمی مقصد بھی ایک ایسے سماج کی تشکیل تھا جہاں کوئی انسان دوسرے کا محتاج نہ ہو اور کوئی کسی پر اپنی اجارہ داری نہ جما سکے۔ عورت کی آزادی کا مسئلہ اس نظریے میں محض ایک الگ موضوع نہیں بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کی تبدیلی کا ایک لازمی حصہ تھا۔ جب تک عورت کو شے سمجھا جاتا رہے گا، سماج میں حقیقی مساوات ممکن نہیں۔ فہمیدہ ریاض نے اس نکتے کو بڑی باریک بینی سے ناول میں اجاگر کیا ہے اور مزدک کے اس انقلابی موقف کو پانچویں صدی کے پس منظر میں آج کے قاری تک بھی اتنا ہی معنی خیز بنا دیا ہے۔

شہنشاہ قباد اور مزدک کا تعلق محض حاکم اور محکوم کا نہیں تھا۔ یہ دو ایسے ذہنوں کا ملاپ تھا جن کے مقاصد الگ الگ تھے مگر راستہ ایک تھا۔ قباد ایک ذہین بادشاہ تھا جو اپنے دربار میں موجود امراء اور مذہبی پیشواؤں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بخوبی واقف تھا۔ وزرگان اور موبدان نے آہستہ آہستہ سلطنت کی اصل باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی اور شہنشاہ کا اقتدار محض ایک رسمی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ قباد نے مزدک کی تحریک میں اس مسئلے کا حل دیکھا۔ اگر مزدک کے نظریات کامیاب ہو جائیں اور امراء کی دولت و جائیداد عوام میں تقسیم ہو جائے تو ان کی طاقت خود بخود ٹوٹ جائے گی۔ یہ اتحاد اس لیے دلچسپ ہے کہ اس میں ایک بادشاہ نے انقلابی نظریات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

فہمیدہ ریاض نے ناول میں یہ دکھایا ہے کہ مزدک کا قباد تک پہنچنا اتفاقیہ نہیں تھا۔ سیاوش جو قباد کا قریبی دوست اور فوج کا اعلیٰ سردار تھا، اس رابطے کا ذریعہ بنا۔ جب قباد نے پہلی بار مزدک کو سنا تو وہ اس کی شخصیت کی گہرائی اور اس کے دلائل کی قوت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مزدک کے پاس وہ بیان تھا جو سننے والے کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور قباد جیسے تیز ذہن بادشاہ نے اس میں اپنے لیے ایک موقع دیکھا۔ جب مزدک پہلی بار قباد کے سامنے آتا ہے اور بادشاہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے ناول سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "اوہ!" اس نے کہا، اور اس کی نظریں نووارد اجنبی کے سراپے پر جم کر رہ گئیں۔ دراز قد اجنبی ایک مہین سفید عبا میں ملبوس تھا۔ اس کی خوبصورت داڑھی اور بال سیاہ تھے۔ بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھیں، گھنے ابرو، ستواں ناک، ایسا دہن جس سے مہربانی مترشح تھی۔ چہرے اور سراپا سے ایسی پاکیزگی ہویدا تھی کہ ایک لمحے کو قباد کو یوں لگا جیسے اس کے کمرے میں کوئی فرشتہ داخل ہو گیا ہو۔ یہ کیسا موبد تھا! دوسرے موبدوں کے برخلاف اس نے قباد کی مدد کی تھی اور اس کی جان بچائی تھی۔ قباد پہلی نظر میں مزدک کا گرویدہ ہو گیا۔"(۱۱)

ناول کا سب سے یادگار منظر وہ ہے جب مزدک کے کہنے پر قباد نے شاہی دربار میں وہ اعلان کیا جس نے پورے ساسانی نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ امراء اور معبدوں کے غلے سے بھرے گودام قحط زدہ کسانوں کے لیے کھول دیے گئے۔ یہ محض ایک خیراتی قدم نہیں تھا بلکہ صدیوں سے چلی آنے والی اس روایت کو توڑنا تھا جس کے تحت وسائل چند گھرانوں کی میراث تھے۔ قباد نے مزدک کو یہ اختیار دیا کہ وہ مساوات کا پرچم بلند کرے اور یہی وہ لمحہ تھا جب ایک نظریہ حقیقت کا روپ دھارنے لگا۔ اس انقلابی لمحے اور اس کے فوری ردِ عمل کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"وہ قباد کے الفاظ تھے، خدا کے نہیں، دنیوی قوت، جبروت اور اختیار کے، جنھوں نے خدائی احکام سے پیدا ہونے والی بے انتہا امید اور آنسو بھرے آسرے کو ٹھوس یقین میں بدل دیا۔ مجمّعے کا رنگ بدل گیا۔ اب پہلے پڑے ہوئے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ باز و فضا میں لہرا رہے تھے۔ جسم امنگ سے اچھل رہے تھے۔ اب ایک شور اٹھ رہا تھا۔ "شہنشاہ قباد۔ جہاں پناہ قباد۔ زندہ باد، زندہ باد اور پائندہ باد"! سیاوش اور فوجی دستے کی معیت میں فاقہ زدوں کا پہلا غول امراء کی حویلیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پہرہ دار انھیں کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی سنگینیں اور تلواریں جھکائے وہ ایک طرف کو ہو گئے۔ تالے توڑ دیے گئے۔ ایک محل کے، پھر دوسرے، پھر تیسرے۔"(۱۲)

مگر تاریخ میں کوئی انقلاب بغیر قیمت کے نہیں آتا۔ جن امراء اور مذہبی طبقوں کو یہ اصلاحات اپنے وجود کے لیے خطرہ لگیں، انہوں نے چپ چاپ بیٹھ کر یہ سب نہیں دیکھا۔ انہوں نے خاموشی سے سازشوں کا جال بُنا اور قباد کو اتنی بھاری سیاسی قیمت چکانی پڑی کہ اسے کچھ عرصے کے لیے اپنا تخت چھوڑ کر جلاوطنی کی تلخی برداشت کرنا پڑی۔

قباد کے انجام سے مصنفہ یہ ثابت کرنا چاہتی کہ جب کوئی حاکم اپنے ہی طبقے کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنوں کی دشمنی مول لینا پڑتی ہے۔ قباد نے مزدک کے نظریات کی حمایت کر کے ایک ایسی آگ بھڑکائی جس کی تپش خود اسے بھی جھلسا گئی۔ وزرگان اور موبدان جو صدیوں سے اپنی اجارہ داری قائم رکھے ہوئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ خود ان کی جڑیں کاٹنے پر تلا ہوا ہے تو انہوں نے چپ چاپ بیٹھنے کے بجائے سازش کا راستہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قباد کو تخت سے بے دخل کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور سلطنت اس کے بھائی جاماسپ کے حوالے کر دی گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ایک بادشاہ کو اپنی ہی سلطنت میں اجنبی بنا دیا گیا۔ اگرچہ قباد نے بعد میں اپنا تخت واپس حاصل کر لیا مگر اس واپسی کی قیمت بہت بھاری تھی۔ اسے اپنے نظریاتی ساتھیوں کو قربان کرنا پڑا اور وہ خواب جو اس نے مزدک کے ساتھ مل کر دیکھا تھا، آہستہ آہستہ بکھرتا چلا گیا۔ اس کے دور کا اختتام اس وقت ہوا جب اس کے بیٹے خسرو نوشیرواں نے اقتدار سنبھالا اور مزدکیت کے خلاف ایک ایسی مہم چھیڑی جس نے اس تحریک کی باقی ماندہ چنگاریوں کو بھی بجھا دیا۔

مزدک کا انجام ناول کا سب سے دردناک اور علامتی حصہ ہے۔ خسرو نوشیرواں نے اقتدار سنبھالتے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ مزدک اور اس کی فکر کو بیک وقت ختم کرنا ہے۔ اس نے مزدک کو سلطنت کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا اور ایک سوچی سمجھی سیاسی چال کے ذریعے اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی۔ یہ محض ایک قتل نہیں تھا بلکہ ایک نظریے کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ مگر خسرو یہاں نہیں رکا۔ اس نے شاہی فرمان جاری کیا کہ مزدک کا نام سلطنت کے دفتروں اور تاریخ کے صفحات سے مٹا دیا جائے۔ اس کے نظریات کو "قلعۂ فراموشی" یعنی انوش بُرد کی نذر کر دیا جائے تاکہ عوام کی یادداشت سے اس کا وجود ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے۔ خسرو نوشیرواں، مزدک کے خلاف حکم نامہ جاری کرتا ہے:

"خسرو نوشیرواں نے تھرتھراتی ہوئی لمبی سانس بھری۔ پھر اس نے وزرگان سے کہا: پ کا کام اب شروع ہوا۔ کل سے مزدک کا نام صفحۂ سلطنت سے مٹا دیجیے۔ اس کا اور اس کے مذموم خیالات کا کہیں ذکر نہ ہو، اس کا نام بھی کسی کی زبان پر نہ آنے پائے۔ ہمیں اس کو نہیں، اس کی یاد کو قلعہ فراموشی کے سپرد کرنا ہے۔ ہوشیار اور خبردار! اگر اس کا ذکر کرنا ہی پڑے تو صرف برائی کے ساتھ کیا جائے۔ اہورا مزدا کے قول دہرانے والا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ امراء اور جاگیردار کے حلق کا کانٹا بنا ہوا یہ انسان ابدی نیند سو گیا۔"(۱۳)

یہ وہی قلعہ تھا جس کا نام لینا بھی قانوناً منع تھا۔ مزدک کو صرف جسمانی طور پر نہیں مارا گیا بلکہ اسے تاریخ کے ضمیر سے بھی کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی۔ فہمیدہ ریاض نے ناول کا عنوان "قلعۂ فراموشی" رکھ کر دراصل اس

پورے المیے کو ایک لافانی معنی دے دیے ہیں۔ وہ کہنا چاہتی ہیں کہ طاقتور طبقہ ہمیشہ سے یہ کوشش کرتا آیا ہے کہ جو انقلابی آوازیں ان کے نظام کو للکارتی ہیں، انہیں لوگوں کے ذہنوں سے مٹا دیا جائے۔ مگر تاریخ کی یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ جس مزدک کو فراموش کرانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا، فہمیدہ ریاض نے اسے پھر سے زندہ کر کے اردو ادب کے صفحات پر امر کر دیا۔ یوں "قلعۂ فراموشی" محض ایک قید خانے کا نام نہیں رہا بلکہ یہ ہر اس انسان کی علامت بن گیا جسے طاقت نے دبانے کی کوشش کی مگر جس کی آواز آج بھی گونجتی ہے۔ یوں وہ تحریک جو ایک بادشاہ کی سرپرستی میں پروان چڑھی تھی، اسی بادشاہ کے خاندان کے ہاتھوں کچل دی گئی۔ فہمیدہ ریاض نے اس المیے کو بیان کرتے ہوئے یہ پیغام دیا ہے کہ انقلابی نظریات کا انحصار جب کسی ایک شخص یا بادشاہ کی مرضی پر ہو تو اس کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے۔ قباد اور مزدک کا اتحاد ایک روشن خواب تھا جو طاقت کے ظلم تلے دفن ہو گیا مگر فراموش نہ ہو سکا۔

فہمیدہ ریاض نے "قلعۂ فراموشی" لکھتے وقت کسی مختصر مطالعے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ڈھائی برس تک تاریخ کی ان پرتوں کو کھنگالتی رہیں جو صدیوں کی گرد میں دب چکی تھیں۔ شاہنامہ، اوستا، بائبل، تاریخِ طبری اور آرتھر کرسٹن سین کی تصانیف۔ یہ مآخذ وہ چراغ تھے جن کی روشنی میں انہوں نے پانچویں صدی کے ساسانی ایران کی گلیوں میں قدم رکھا۔ ناول میں موجود جغرافیائی تفصیلات، سیاسی ڈھانچہ اور مذہبی رسوم سب تاریخی حقائق پر استوار ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے مزدک کی اس تحریک کو دوبارہ زندہ کیا جسے بعد کے مورخین نے جان بوجھ کر فراموش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ محض ناول نگاری نہیں بلکہ تاریخ کے ساتھ ایک گہرا انصاف تھا۔ پروین ناول کے تاریخی بیانیے کے بارے میں رائے دیتی ہیں:

> "فہمیدہ ریاض نے اپنے ناول میں مزدک کو مرکزی بیانیے کا نمائندہ کردار بنایا ہے۔ وہ تاریخ کا پہلا انقلابی سمجھا جاتا ہے اور اشتراکی فکر کا ابتدائی ترجمان تھا۔ اس کردار کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے مصنفہ نے مختلف تذکروں، تاریخی روایات، قدیم مذہبی عقائد اور کتب، سفرناموں اور سلطنتِ ساسانی کے نقشوں کو ناول کے متن میں شامل کیا ہے۔ مزدک کے عہد میں ایران میں زرتشت مذہب غالب تھا اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہندومت اور زرتشت مذہب کے درمیان کئی فکری اور عقیدتی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ بیانیے کو دستاویزی رنگ دینے کے لیے مصنفہ نے اوستا جو قدیم زرتشتی مذہب کی مقدس تحریروں کا مجموعہ ہے، اس کے تراجم کو ناول کے متن میں جابجا پیش کیا ہے تاکہ اس عہد کی مذہبی فضا کو زیادہ سے زیادہ مستند انداز میں قاری تک پہنچایا جا سکے۔"(۱۴)

تاریخ کے پاس حقائق ہوتے ہیں مگر جذبات نہیں ہوتے۔ واقعات ہوتے ہیں مگر انسانی دھڑکن نہیں ہوتی۔ فہمیدہ ریاض نے اپنے تخیل کے ذریعے اس کمی کو پورا کیا اور تاریخ کے خشک کرداروں میں ایک زندہ روح پھونک دی۔ مزدک اور دیگر کردار ناول میں محض نام نہیں بلکہ وہ ہنستے ہیں، روتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں اور غلطیاں بھی کرتے ہیں۔ جہاں جہاں تاریخ خاموش تھی، وہاں مصنفہ کے تخیل نے مکالمے بنائے، جذبات بھرے اور اس خلا کو اس طرح پُر کیا کہ جوڑ کہیں سے نظر نہیں آتا۔ یہی وہ فنی کمال ہے جو ایک عام تاریخی روایت کو ایک رومان پرور داستان میں بدل دیتا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے ساسانی عہد کی تہذیب کو محض پس منظر کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اسے اپنی تمام رنگارنگی اور پیچیدگی کے ساتھ صفحات پر اتار دیا ہے۔ زرتشتی مذہب کی وہ قدیم رسوم جو آج ہمیں عجیب لگتی ہیں، مصنفہ نے انہیں اس عہد کے انسان کی نظر سے دکھایا ہے۔ لاشوں کو ناپاک سمجھنا، بیل کے پیشاب سے پاکیزگی حاصل کرنا اور آتش کدوں سے قرض لینے کا رواج۔ یہ تمام رسوم اور روایات اس معاشرے کی مذہبی ذہنیت کا عکس ہیں جو صدیوں سے چلی آ رہی تھیں۔ ساسانی دربار میں طبقاتی تقسیم کی جو دیوار تھی، فہمیدہ ریاض نے اسے بھی پوری تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ عامیوں اور وزرگان کے

درمیان ایک ایسی خلیج حائل تھی جسے نہ کوئی پاٹ سکتا تھا اور نہ کوئی پھلانگ سکتا تھا۔ ان تلخ سماجی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے اس دور کے پکوانوں، لباس کی رنگارنگی، فنِ خطاطی کی نزاکتوں اور علمِ نجوم سے لوگوں کے گہرے لگاؤ کو بھی بیان کیا ہے۔ ان جزئیات نے مل کر ایک ایسا تہذیبی نقشہ بنا دیا ہے جو پڑھتے ہوئے صفحات سے اٹھ کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

فہمیدہ ریاض کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ وہ تاریخ کو صرف حاکموں اور جنگوں کی داستان نہیں سمجھتیں بلکہ اسے عورت کی نظر سے بھی پڑھتی اور پرکھتی ہیں۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ سیاسی اور مذہبی جبر کا سب سے بھاری بوجھ ہمیشہ عورت کے کندھوں پر ہی آ گرتا تھا۔ ملکہ سلطنت دینگ کا وہ واقعہ جب حیض کے دوران اسے محل کی آسائشوں سے محروم کر کے ننگے فرش پر سونے پر مجبور کیا گیا، یہ بتاتا ہے کہ صنفی تذلیل کسی طبقے کی سرحد نہیں جانتی تھی۔ تاج و تخت کی مالکہ بھی اس سے نہ بچ سکی۔ یہ وہ تکلیف دہ سچائی ہے جسے تاریخ نے ہمیشہ حاشیے پر رکھا مگر فہمیدہ ریاض نے اسے درمیان میں لا کھڑا کیا۔

اس ناول کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ تاریخ کے وہ حقائق جو کتابوں میں بے جان الفاظ بن کر پڑے تھے، فہمیدہ ریاض کے قلم سے گزر کر ایک سانس لیتی داستان بن گئے۔ جہاں تاریخ نے منہ موڑ لیا اور خاموشی اختیار کر لی، وہاں مصنفہ کے تخیل نے قدم رکھا اور کرداروں کو وہ انسانی روح عطا کی جو محض تاریخی ریکارڈ میں نہیں ملتی۔ یہ کردار ہنستے اور روتے ہیں، آرزوئیں پالتے ہیں، ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اپنی غلطیوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ یہ ناول اس لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہے کہ یہ ماضی کی کہانی سناتے ہوئے مارکسیت اور تانیثیت جیسے جدید فکری دھاروں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یوں یہ صرف ایک تاریخی روایت نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صدیوں کا فاصلہ سمٹ جاتا ہے اور ماضی حال کے ساتھ آمنے سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔

فہمیدہ ریاض نے وہ کام کیا جو تاریخ دان نہ کر سکے۔ خسرو نوشیرواں نے مزدک اور اس کی فکر کو "قلعۂ فراموشی" کی نذر کر کے ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا چاہا تھا مگر فہمیدہ ریاض نے اس گم گشتہ باب کو تاریخ کی گرد سے نکال کر دوبارہ عوامی حافظے میں زندہ کر دیا۔ ان کا یہ ناول تحقیق اور تخلیق کے درمیان ایک ایسا پل ہے جو قاری کو چودہ سو سال پرانے ایران کی گلیوں میں لے جاتا ہے اور واپس لاتے وقت اس کے ذہن میں بہت سے ایسے سوال چھوڑ جاتا ہے جن کے جواب آج بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے پانچویں صدی میں تھے۔

کسی بھی تاریخی ناول کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ قاری اسے پڑھتے ہوئے یہ نہ سوچے کہ وہ کوئی درسی کتاب پڑھ رہا ہے۔ فہمیدہ ریاض اس آزمائش میں کامیاب رہی ہیں۔ ناول پڑھتے ہوئے قاری خود کو پانچویں صدی کے ایران کی گلیوں میں محسوس کرتا ہے، وہاں کی خوشبو سونگھتا ہے اور وہاں کے درد کو اپنے اندر اترتا ہوا پاتا ہے۔ انسانی حواس کی جزئیات، حسن و جمال کی باریکیاں اور طبقاتی جبر کی تلخیاں یہ سب مل کر ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیتے ہیں جو بیک وقت تاریخ بھی ہے اور ادب بھی۔ یہ فہمیدہ ریاض کے نسائی شعور اور تخلیقی قوت کا وہ مظہر ہے جو انہیں اردو ادب کی ممتاز ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) وہاب اشرفی، مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب، (دہلی، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۲

(۲) فریڈرک اینگلز، سرمایہ، خاکہ، تبصرے اور ضمنی مواد، مترجم: امیر اللہ خان، (لاہور، طبقاتی جدوجہد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۴

(۳) فہمیدہ ریاض، قلعۂ فراموشی، (کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء)، ص ۵۳

(۴) ایضاً، ص ۴۰ (۵) ایضاً، ص ۶۰۔ (۶) ایضاً، ص ۱۱۔

(۷) ایضاً، ص ۸ (۸) ایضاً، ص ۷۔ (۹) ایضاً، ص ۳۔

(۱۰) اقرا غفار، "قلعہ فراموشی از فہمیدہ ریاض: ایک تجزیہ" مشمولہ جرنل آف آرٹس اینڈ لینگویج سٹڈیز، شمارہ ۱، جلد ۱ (۲۰۲۳ء)، ص ۳۰۔

(۱۱) فہمیدہ ریاض، قلعۂ فراموشی، (کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۔

(۱۲) ایضاً، ص ۶۸۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۶۰۔

(۱۴) نازیہ پروین، "اردو ناول میں تاریخی بیانیہ" مشمولہ بازیافت، شمارہ ۳۸، (لاہور، ادارۂ زبان و ادبیات اردو پنجاب یونیورسٹی، جنوری تا جون ۲۰۲۱ء)، ص ۹۴۔

References

(1) Wahab Ashrafi, *Marxi Falsafa, Ishtirakiyat aur Urdu Adab*, (Delhi, Afeef Offset Printers, 2010), p. 42.

(2) Friedrich Engels, *Sarmaya: Khaka, Tabsiray aur Zimni Mawad*, Mutarjim: Amirullah Khan, (Lahore, Tabqati Jaddojehad Publications, 2014), p. 24.

(3) Fehmida Riaz, *Qila-e-Faramoshi*, (Karachi, Oxford University Press, 2017), p. 53

(4) ibid, p.40. (5) ibid, p.60. (6) ibid, p.11.

(7) ibid, p.8. (8) ibid, p. 7. (9) ibid, p.3.

(10) Iqra Ghaffar, "Qila-e-Faramoshi az Fehmida Riaz: Aik Tajziya", *Journal of Arts and Language Studies*, Shumara 1, Jild 1 (2023), p. 30.

(11) Fehmida Riaz, *Qila-e-Faramoshi*, p.2

(12) ibid, p.68. (13) ibid, p.160.

(14) Nazia Parveen, "Urdu Novel mein Tareekhi Bayania", *Bazyaft*, Shumara 38, (Lahore, Idara-e-Zaban-o-Adabiyat Urdu, Punjab University, January–June 2021), p. 94.

❖❖❖